ڈاکٹر محمد آصف

اسلام اور مغرب کے مابین مکالمے کی صورت سر سیّد اور اقبال کے حوالے سے

صلیبی جنگوں کے بعد سے آج تک مختلف مستشرقین کی طرف سے بڑے تواتر کے ساتھ اسلام اور حضور پاکؐ پر تلوار اور تشدد کا الزام لگایا جاتا رہا ہے۔ اگرچہ یورپ میں بھی ایسے انصاف پسند اور مؤرخین ہر عہد میں موجود رہے ہیں جو اِس نوع کے الزامات کی تردید کرتے رہے ہیں تاہم سویت یونین کے خاتمے کے بعد امریکہ اور دیگر مغربی ممالک میں اِس معاندانہ پروپیگنڈے کو ایک مرتبہ پھر ایسے طوفانی انداز میں آگے بڑھایا جا رہا ہے کہ پوری دنیا کے ذہن اِسلام اور مسلمانوں کے بارے میں مسموم ہو کر رہ گئے ہیں۔ ایڈورڈ سعید کے مطابق یورپ اور امریکہ میں اِس قسم کے مطالعات کا ایک بڑا وسیع اور منظم سلسلہ موجود ہے۔ مشترکہ کاروباری ادارے، تیل کمپنیاں، فاؤنڈیشنز، عیسائیت کے تبلیغی ادارے، مالی معاوضے کی انجمنیں ہیں، تعلیمی و تحقیقی اداروں اور دانشوروں کا ایک جال ہے، مراکز ہیں، شعبے اور ذیلی شعبے ہیں، یہ سب کے سب اسلام، مشرق اور عربوں کے بارے میں چند بنیادی اور مبتذل خیالات کو مدلل انداز میں فروغ دینے کے لیے دن رات مصروف ہیں۔(۱) اور اِس کا سب سے بڑا ثبوت ڈنمارک کے اخبار ''جیلانڈز پوسٹن'' (Jyllands Posten) میں حضورِ اقدسؐ سے متعلق توہین آمیز خاکوں کی اشاعت ہے جن کو مغرب کے کم و بیش ۴۵ ممالک میں اور ۱۷۵ اخبارات میں

شائع کیا گیا اور تقریباً ۲۰۰ ٹی۔وی اسٹیشنوں سے نشر کیا گیا۔ (۲) ہنٹنگٹن (Huntington) کی کتاب ''Clash of Civilizations'' انہی پرانی عصبیتوں کو اُبھارنے کی ایک مذموم کوشش ہے۔اس کے نزدیک اسلامی تہذیب کی بنیاد پرستی، تنگ نظری، تشدد، جہالت اور آمریت کی وجہ سے اس کا مغرب سے تصادم ناگزیر ہے اور ایک مہذب اور ترقی یافتہ تہذیب ہونے کی وجہ سے یہ مغرب کی ذمہ داری ہے کہ وہ اسلام کو مہذب اور جمہوری بنائے (۳) اسلام کو متشدد قرار دیتے ہوئے وہ لکھتا ہے:

''اسلام کی سرحدیں خونیں ہیں'' ''مسلمانوں کا جھگڑالو پن اور تشدد بیسویں صدی کے حقائق ہیں جن سے مسلمان انکار کر سکتے ہیں نہ غیر مسلم'' ''اسلام ابتدا ہی سے تلوار کا مذہب رہا ہے'' ''قرآن اور مسلم عقائد کے دوسرے بیانات میں تشدد کے امتناع کے بارے میں بہت کم احکامات ہیں اور عدم تشدد کا تصور مسلم عقائد اور عمل میں نہیں پایا جاتا۔'' (۴)

(مغربی نوآبادیاتی نظام اور سامراجی ''تہذیبی مشن'' کو فی الحال رہنے دیجیے یہاں صرف اتنا ملاحظہ کیجیے کہ مغرب اسلام کو کس نظر سے دیکھتا ہے چنانچہ) حال ہی میں امریکی تھنک ٹینک رینڈ کارپوریشن (Rand Corporation) نے اسلام کے بارے میں ایک رپورٹ ''Civil Democratic Islam'' کے نام سے مرتب کی ہے جس میں اس نے مسلم دنیا میں بڑھتی ہوئی عسکریت اور دہشت پسندی، بین الاقوامی دھارے سے عدم مطابقت اور ترقی ونشوونما کے حصول میں ناکامی کو اسلام کے موجودہ بحران اور اسلام ومغرب کے مابین تصادم کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔ اور ترقی یافتہ مغرب کا یہ فرض قرار دیا ہے کہ وہ زوال یافتہ، غیر مہذب اور غیر جمہوری اسلام کو ترقی یافتہ، مہذب اور جمہوری بنائے (۵)

یقیناً اسلام موجودہ تہذیبی کشمکش میں وقت کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے، ہندوستان میں کچھ ایسی ہی کشمکش کا سامنا ۱۸۵۷ء کے بعد سرسیّد کو بھی کرنا پڑا تھا۔

۱۸۵۷ء کے بعد نہ صرف نئی نئی معاشرتی وتہذیبی تبدیلیاں رونما ہوئیں بلکہ اس نے اسلامی اقدار کو بھی چیلنج کیا۔ جس کے نتیجے میں نئی اور پرانی قدروں یا جدیدیت اور قدامت میں ایک کشمکش سی شروع ہوگئی۔ اس پیچیدہ نفسیاتی کیفیت اور نازک حالات میں بقول ابوالحسن علی ندوی دو قسم کی قیادتیں اُبھر کر سامنے آئیں۔

دینی قیادت ...... جس کے علمبردار علمائے دین تھے۔

جدیدیت پسند قیادت ...... جس کے علمبردار سرسیّد اور ان سے وابستہ جدید مکتبِ خیال کے افراد تھے۔(۶)

عزیز احمد نے لکھا ہے کہ روایت پرستی کو سب سے پرزور چیلنج کا سامنا ۵۸۔۱۸۵۷ء کے تباہ کن نتائج کے دورِ مابعد میں کرنا پڑا۔ جدیدیت پسندوں کے اعتراض کے جواب میں روایت پرستوں نے راسخ الاعتقادی اور عظیم دینی مکاتب ...... کی پناہ گاہوں میں اپنے آپ کو محصور کرلیا۔''(۷) چنانچہ جدید مکتبِ خیال کے برعکس دینی قیادت ماضی اور روایات کی پرستار تھی۔ دارالعلوم دیوبند (۱۸۶۷ء) اور ندوۃ العلماء لکھنؤ (۱۸۹۴ء) وغیرہ اس دینی قیادت کے علمبردار تھے۔ علماء کی شاندار دینی خدمات، خلوص، روحانی پاکیزگی اور اسلام سے وفاداری اپنی جگہ تاہم بحیثیت مجموعی ان کے ہاں علم اور تہذیبِ جدید کے باب میں انگریزوں کی مخالفت کا انداز متشددانہ رہا ہے۔ اِس قیادت کی تعلیم میں سب سے بنیادی خرابی یہ تھی کہ اس کے تحت مذہب کے عقائد کو جامد شے سمجھا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان جدید تعلیم سے اور جدید زمانے کی ضروریات سے بے خبر ہو کر رہ گئے۔ بالعموم انگریزی چیزوں اور انگریزی خیالات کو مشتبہ نظروں سے دیکھا گیا۔ درسِ نظامیہ نظامِ تعلیم بنا دیا گیا۔ یہ قیادت تحریکِ اتحادِ اسلامی کی حامی اور جہاد کی شدت

پسندی کے ساتھ قائل تھی۔ برطانوی حکومت کی سخت مخالف تھی۔ الغرض ہندوستان میں علماء کا نقطۂ نظر سرسیّد کے متوازی اور برعکس تھا۔ دونوں کا آخری سرچشمۂ فیض ایک ہی تھا یعنی شاہ ولی اللہ کے خاندان کی تعلیمات لیکن دونوں کے مقاصد اور طریق کار میں بُعدِ عظیم تھا۔ قدامت پرستی، بنیاد پرستی، دورِ وسطیٰ کی منطق طرازی اور تصوف، جدید تعلیم اور سائنس سے گریز، مادی ترقی سے دوری، اندازِ خانقاہی نظریات میں شدت اور اسلامی تحریک میں انتہا پسندانہ طریق کی جانب اِن کا جھکاؤ رہا ہے۔(۸) انہوں نے شاہ ولی اللہ کے خیالات کی نئے حالات کے مطابق نئی تشکیل نہیں کی۔ بلکہ شیخ اکرام کے مطابق ''انہوں نے شاہ ولی اللہ کے طریق کار کی بجائے خیالات کی پیروی کی ہے نتیجتاً ان کے ہاں روایت پسندی کا عنصر پیدا ہوگیا ہے۔''(۹)

دوسری قیادت جدیدیت پسندوں کی تھی جس کے علمبردار سرسیّد (۱۸۱۷ء۔۱۸۹۸ء) تھے۔ علماء کے نقطۂ نظر اور طریق کار کے برعکس سرسیّد کی تمام تر حکمتِ عملی دو بنیادی نکات کے گرد گھومتی ہے۔

''سیاست میں اطاعت شعاری اور اداروں میں جدیدیت۔''(۱۰)

چنانچہ ان کی ساری حکمتِ عملی اس غالب خیال کے ماتحت رہی کہ انگریزوں کی حکومت مسلمانوں سے بہت زیادہ طاقتور ہے۔ ان کو طاقت کے ذریعے نہیں ہٹایا جاسکتا۔ انگریزوں کے خلاف طویل عسکری جدوجہد میں ناکامی کے بعد اب مسلمان تھک چکے ہیں اور احساسِ کمتری میں مبتلا ہیں۔ جدید مغربی علوم اور تہذیب وتمدن اختیار کرنے ہی سے مسلمان ترقی کرسکتے ہیں۔ مغرب کے اِن ہتھیاروں ہی کے ذریعے مغرب کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے اور یونہی ان کا احساسِ کمتری ختم ہوسکتا ہے۔ انگریزوں کے ساتھ بے تکلف رہنے ہی سے ان کی حیثیت بڑھ سکتی ہے۔(۱۱)

چنانچہ ایک جگہ انہوں نے لکھا کہ:

''ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ کی سویلزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جاوے تا کہ جس حقارت سے سویلزڈ یعنی مہذب قومیں ان کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہو اور وہ دنیا میں معزز اور مہذب کہلاویں۔'' (۱۲)

سرسیّد انگریزی تعلیم کو معاشی، سیاسی، انتظامی، معاشرتی غرض زندگی کے تمام امور میں ترقی کے لیے ضروری سمجھتے تھے انہوں نے ایجوکیشنل کانفرنس کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے فرمایا تھا:

''جن لوگوں کا خیال ہے کہ پولیٹیکل امور میں بحث کرنے سے ہماری ترقی ہوگی اس سے میں اتفاق نہیں کرتا، بلکہ میں تعلیم کی ترقی اور صرف تعلیم کو ذریعہ قومی ترقی کا سمجھتا ہوں۔'' (۱۳)

سرسیّد کا نقطۂ نظر ہرگز یہ نہیں تھا کہ مسلمان محض انگریزی تعلیم وتہذیب کے ہوکر رہ جائیں۔ ان کا منشا یہ تھا کہ:

''ہم بلاشبہ اپنی قوم کو اپنے ہم وطنوں کو سویلائزڈ قوم کی پیروی کی تلقین کرتے ہیں مگر اِن سے خواہش رکھتے ہیں کہ ان کی جو خوبیاں ہیں اِن کی پیروی کریں نہ ان کی ان باتوں کی جو ان کے کمال میں نقص کا باعث ہیں۔'' (۱۴)

ان کے نزدیک مسلمانوں کی ترقی کی صرف یہی صورت تھی کہ مسلمان انگریزوں سے دوبارہ وہ علم وحکمت حاصل کریں جو کسی زمانے میں مغربی اقوام نے مسلمانوں سے حاصل کیے تھے۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کا عروج اسلام سے لگاؤ تھا اور مسلمانوں کا زوال اسلام سے دوری ہے۔ انگریزوں کی ترقی بھی انہی اصولوں پر چلنے سے ہوئی تھی۔ چنانچہ:

''اسلام ہی ان کے نزدیک مسلمانوں کے دُکھ کا مداوا ہے لیکن روایتی اسلام نہیں بلکہ وہ اسلام جو مغرب نے عربوں سے حاصل کیا اور اسے اتنے عروج پر پہنچا دیا کہ خود مسلمان پہچاننے سے قاصر رہ گئے۔''(۱۵)

چنانچہ سرسیّد کا اوّلین مقصد اسلام کی حفاظت اور اسلام کی حقیقی روح کو اُجاگر کرنا تھا اِس مقصد کے لیے سرسیّد نے جدید علمِ کلام کے ذریعے مذہب اور سائنس بالفاظِ دیگر اسلام اور مغرب کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ ان کا مؤقف تھا کہ:

''اِس زمانے میں ایک جدید علمِ کلام کی حاجت ہے جس سے یا تو ہم علومِ جدیدہ کے مسائل کو باطل کردیں یا مشتبہ ٹھہرادیں یا اسلامی مسائل کو ان کے مطابق کر دکھائیں کہ اِس زمانے میں صرف یہی صورت حمایت اور حفاظتِ اسلام کی ہے۔''(۱۶)

انہوں نے مزید فرمایا:

''فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا اور نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور کلمہ لا الٰہ الاّ اللہ کا تاج سر پر۔''(۱۷)

سرسیّد نے مغربیت اور جدیدیت کے درمیان فرق اُجاگر کرکے مسلمانوں میں جدید ٹیکنالوجی اور مغربی سائنس کا شوق پیدا کیا۔ انہوں نے قرونِ وسطیٰ کی ذہنیت رکھنے والے علماء کو بھی یہ احساس دلایا کہ وہ وقت کے تقاضوں کو سمجھیں۔ سرسیّد تحریک کے زیر اثر کم ازکم اتنا ضرور ہوا کہ انگریزی تعلیم وتہذیب کی طرف مسلمانوں کے نفرت انگیز روّیے میں کمی واقع ہوگئی۔ اس کے برعکس مغربی تہذیب کے زندہ اجزاء سے استفادہ کرنے اور منفی اجزاء سے بحث کرنے کا عام روّیہ پیدا ہونے لگا۔ مغربی علوم وفنون پر اعتماد اور انگریزوں سے مکالمے کی ایک فضا قائم ہونے لگی۔ یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ پچھلے سو سال

سے مسلمان جو کچھ تھے اور آج جو کچھ ہیں اس پر سرسیّد تحریک کا گہرا اثر ہے۔ حنیف رامے نے درست کہا ہے کہ اِس تحریک نے:

''ایسی پُر اعتماد نسل پیدا کی جس نے اسلام سے اپنی بنیادی وفاداری کو ترک کیے بغیر جدید حالات کے تقاضوں میں قوم کی سیاسی، تہذیبی بیداری میں حصہ لیا۔ سرسیّد احمد خان نے مغربیت (Westernization) اور جدیدیت (Modernization) کے فرق کو اُجاگر کرکے برصغیر کے مسلمانوں کو جدید تعلیم کے راستے پر نہ ڈالا ہوتا تو آج ہم جہالت کی دلدل میں اس بری طرح پھنسے ہوتے کہ نہ ہم میں کوئی اقبال پیدا ہوتا نہ محمد علی جناح۔'' (۱۸)

سرسیّد کا روّیہ سراسر علماء کے برعکس تھا چنانچہ راسخ العقیدہ علماء نے سرسیّد کی مخالفت کی لیکن اقبال سرسیّد کے بارے میں بہت معتدل رائے رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک سرسیّد:

''عصر جدید کے پہلے مسلمان تھے جنہوں نے آنے والے دور کی جھلک دیکھی اور یہ محسوس کیا تھا کہ ایجابی علوم اِس دور کی خصوصیت ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کی پستی کا علاج جدید تعلیم کو قرار دیا۔ مگر سرسیّد احمد خان کی حقیقی عظمت اس واقعہ پر مبنی ہے کہ یہ پہلے ہندوستانی مسلمان ہیں جنہوں نے اسلام کو جدید رنگ میں پیش کرنے کی ضرورت محسوس کی۔'' (۱۹)

اقبال کے نزدیک سرسیّد چاہتے تھے کہ:

''بحیثیت قوم انہیں (مسلمانوں کو) سمجھ لینا چاہیے کہ مغرب کے

سیاسی، معاشی استیلا یا علوم وفنون میں ان کے اجتہادات یا اختراعات نے ہمارے لیے کیا مسائل پیدا کر دیے ہیں۔ وہ اعتماد رکھیں کہ مغربی تہذیب وتمدن اور علم وحکمت کی جو رَوانگریزی تسلط کے ساتھ آ گئی ہے، ڈرنے کی چیز نہیں ہے ہم اس سے استفادہ کر سکتے ہیں، اسلامی عقائد کو اس سے کوئی خطرہ نہیں۔''(۲۰)

حقیقت یہ ہے کہ اقبال نے سرسیّد کے اسی کام کی تکمیل کی ہے۔ مغربی تہذیب وتمدن اور علم وحکمت سے استفادے، ہم آہنگی اور مغرب سے مکالمے کے کام کو آگے بڑھایا ہے۔ سرسیّد جو مغرب سے استفادے کے معاملے میں مرعوب ہو گئے تھے اور اس مرعوبیت کی وجہ سے جو انتہا پسندی اور مادہ پرستی کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی اقبال نے اسے دور کر کے ایک توازن کی کیفیت اور تنقیدی بصیرت پیدا کی ہے۔ چنانچہ عابد علی عابد کا یہ تجزیہ درست ہے کہ ''اقبال نے سرسیّد اور حالی کے کام کی تکمیل کردی''(۲۱) جہاں تک علماء کا تعلق ہے تو اقبال علماء اور فقہا کی قدامت پرستی، تنگ نظری، شدت پسندی اور جمود کے سخت خلاف تھے۔ ان کا مؤقف یہ تھا کہ:

''زمانۂ حال کے علماء یا تو زمانہ کے میلانِ طبیعت سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا ہیں۔''(۲۲)

جلوتیانِ مدرسہ کور نگاہ و مردہ ذوق
خلوتیانِ مے کدہ کم طلب و تہی کدو(۲۳)

اقبال نے صاحب زادہ آفتاب احمد کے نام ۴ جون ۱۹۲۵ء کو لکھے جانے والے خط میں علی گڑھ یونی ورسٹی میں علومِ اسلامیہ کے مطالعہ کے لیے کچھ تجاویز دیں تھی جن میں دیوبند اور ندوہ کے حوالے سے بھی بات چیت کی تھی۔ اِس گفتگو سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال دیوبند اور ندوہ کے طلبہ کی عربی قابلیت کو تسلیم تو کرتے تھے لیکن اِس کے ساتھ

ساتھ ان تمام مسلم علماء کو اور مسلم دینیات کو جدید علوم وفنون سے ہم آہنگ کرنا چاہتے تھے وہ چاہتے تھے ندوہ اور دیوبند کے بہترین مواد کو برسرِ کار لانے کے لیے کوئی سبیل نکالی جائے۔ ان کے نزدیک اِس قسم کے مدرسوں کی حالت　غیر تسلی بخش تھی اور قانونِ محمدی سرتاسر تعمیری تشکیل کا محتاج تھا (۲۴)

مزے کی بات یہ ہے کہ جس طرح سرسیّد کی روشن خیالی پر علماء نے برہمی کا اظہار کیا تھا اسی طرح وہ اقبال کی ''تشکیلِ جدید'' کی کوششوں سے بھی نالاں تھے۔ سیّد سلیمان ندوی اور ابوالحسن علی ندوی کی علمی و مذہبی خدمات کا بھلا کون منکر ہوسکتا ہے لیکن اِن جید علماء کا روّیہ بھی اقبال کے اجتہادی خیالات کے بارے میں کیا تھا۔ ذرا ابوالحسن علی ندوی صاحب کا یہ بیان ملاحظہ کیجیے:

''ان (اقبال) کے مدراس کے خطبات میں جو انگریزی میں ''Reconstruction of Islamic thought'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں، اور اِن کا عربی اُردو ترجمہ بھی ہوا ہے، میں بہت سے ایسے خیالات و افکار ملتے ہیں جن کی تاویل و توجیہہ اہل سنت کے اجتماعی عقائد سے مطابقت مشکل ہی سے کی جاسکتی ہے۔ یہی احساس استادِ محترم مولانا سیّد سلیمان ندوی کا تھا، ان کی یہ تمنا تھی کہ یہ لیکچر شائع نہ ہوتو اچھا تھا۔'' (۲۵)

پروفیسر فتح محمد ملک نے بے حد دلچسپ نشان دہی کی ہے کہ:

''بیشتر علمائے دین کی مانند مولانا کو اقبال کا اجتہادی روّیہ اتنا ناگوار گزرا ہے کہ وہ ان کی عہد آفریں تصنیف کا نام بھی اپنے حافظے میں محفوظ نہیں کر سکے۔'' (۲۶) (جیسا کہ مندرجہ بالا نام سے ظاہر ہے)۔

اقبال علمائے اسلام اور مذہبی جماعتوں کی اِس روش سے بیزار تھے۔ اِسی مُلّائی روش کے بارے میں اقبال فرما چکے ہیں کہ:

''دینِ مُلّا فی سبیل اللہ فساد'' (۲۷)

اقبال کا یہ تصورِ اسلام مُلّا کے جامد روایتی تصورِ اسلام سے سرتا سر مختلف ہے اور اسی طرح مغربی تہذیب کے متعلق بھی ان کا روّیہ علماء کے برعکس کشادہ دلی پر مبنی ہے اور سرسیّد کے روّیے سے متاثر ہے۔ اقبال نے مغربی تہذیب کو اسلامی تہذیب کے بعض پہلوؤں کی ترقی یافتہ شکل قرار دے کر درحقیقت مغرب اور اسلام کے مابین ایک پُل یا رابطہ استوار کرنے کی کوشش کی ہے۔ (۲۸) ''تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ'' کا مقصود بھی یہی ہے۔ اقبال کا مؤقف ہے کہ:

> ''پچھلے پانچ سو برس سے الٰہیاتِ اسلامیہ پر جمود کی کیفیت طاری ہے۔ وہ دن گئے جب یورپ کے افکار دنیائے اسلام سے متاثر ہوا کرتے تھے تاریخِ حاضرہ کا سب سے زیادہ توجہ طلب مظہر یہ ہے کہ ذہنی اعتبار سے عالمِ اسلام نہایت تیزی کے ساتھ مغرب کی طرف بڑھ رہا ہے اس تحریک میں بجائے خود کوئی خرابی نہیں کیونکہ جہاں تک علم وحکمت کا تعلق ہے، مغربی تہذیب دراصل اسلامی تہذیب ہی کے بعض پہلوؤں کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے لیکن اندیشہ یہ ہے کہ اس تہذیب کی ظاہری آب وتاب کہیں اس تحریک میں حارج نہ ہوجائے اور ہم اس کے حقیقی جوہر، ضمیر اور باطن تک پہنچنے سے قاصر رہیں۔'' (۲۹)

چنانچہ اقبال کے نزدیک مغربی تہذیب ڈرنے کی چیز نہیں بلکہ مسلمان اس سے ستفادہ کرسکتے ہیں (۳۰) اِس لیے کہ یہ تہذیبی سرچشمہ تو وہی ہے جو خود اس کے تخلیقی

سوتوں سے پھوٹا تھا۔ البتہ احتیاط طلب امر یہ ہے کہ مسلمان مغرب کی حقیقی اندرونی روح یعنی مغرب کی صحت مند اقدار، سائنسی علوم اور ٹیکنالوجی کو حاصل کریں نہ کہ ظاہری چمک دمک کو۔ اس اعتبار سے مغربی تہذیب اسلام کے لیے کوئی خطرہ نہیں بلکہ مسلمانوں کے لیے تعمیر وترقی کا وسیلہ ہے۔ اِس کے لیے اقبال کے نزدیک پورے طور پر ناقدانہ بصیرت اور آزادانہ تحقیق کی ضرورت ہے تاکہ دونوں تہذیبوں کے بنیادی خدوخال سامنے آسکیں اور اس سے اپنے بنیادی اصولوں کی روشنی میں استفادہ کرنے میں آسانی ہو(۳۱) پھر اس کے ساتھ اسلام کے اصولوں کی درست تشریح بھی ضروری ہے تاکہ اسلام بحیثیت ایک ایسے پیام کے، جس کا خطاب ساری نوعِ انسانی سے ہے، اُجاگر ہو سکے(۳۲) اقبال کا یہ مؤقف بالکل درست ہے کہ وہ دن گئے جب مغرب اسلام سے متاثر ہوا کرتا تھا اس لیے کہ اسلام کے زوال پذیر دور میں مغرب تو اسلام سے متاثر ہونے سے رہا۔ مغرب اِس وقت مادی ترقی کے عروج پر ہے چنانچہ فطری طور پر عالمِ اسلام ہی مغرب کی طرف بڑھے گا۔ پس مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان مغرب سے استفادہ کرتے ہوئے اس ''فسادِ قلب ونظر''(۳۳) میں مبتلا نہ ہوں جس میں مغرب مبتلا ہے...... تہذیبوں کی کشمکش میں عالمِ اسلام کو مغرب سے استفادہ کرنے کا مشورہ دینا بے حد جراتمندانہ اور اہمیت کا حامل مرحلہ ہے اِس لیے کہ اس سے دونوں تہذیبوں کے مابین مشترک رشتوں کی وضاحت ہوتی ہے(جو تصادم کے ماحول میں یقیناً ایک جراتمندانہ عمل ہے)۔

دوسرے لفظوں میں اقبال (سرسیّد ہی کی طرح) اسلام اور مغرب کے مابین ایک رشتۂ مطابقت استوار کرنا چاہتے ہیں۔ ایک ایسا اشتراکِ عمل جس میں دونوں تہذیبوں کی فطری امتیازی خصوصیات بھی برقرار رہتی ہیں اور دونوں ایک دوسرے کے قریب بھی آجاتی ہیں اور اس طرح دونوں کے مابین ایک اصولی اور پُر امن مکالمے کی

راہیں ہموار ہوتی ہیں۔

اقبال کے اس اقتباس سے ایک نکتہ اور بھی سامنے آتا ہے کہ مغربی تہذیب کی یلغار اور دست برد سے نمٹنے کے مجموعی طور پر تین روّیے ہو سکتے ہیں:

۱......ایک تو مغربی تہذیب کے مکمل استرداد کا روّیہ۔ یہ روّیہ منفی ہے اور قدامت پرستی و تنگ نظری پر مبنی ہے۔ آج کے جدید دور میں جبکہ دنیا مغرب ہی کی ترقیوں کی وجہ سے گلوبل ولیج بن چکی ہے مغرب کے اثرات سے بچنا اور مکمل طور پر اس تہذیب سے رشتہ منقطع کرنا ناممکن ہے اور اس روّیے کے نتائج بھی کچھ اچھے نہیں نکلیں گے۔ چنانچہ ایسے ہی لوگوں کو مغرب میں جنگجو، جہادی، بنیاد پرست، دہشت گرد، قدامت پرست کہا جاتا ہے۔ اسی روّیے کی بدولت مغرب میں اسلام کا امیج خراب ہوا ہے مثلاً گرونیبام لکھتا ہے: ''اسلام غیر تخلیقی، غیر سائنسی اور غیر عقلی ہے اور جدید دنیا کی تمناؤں میں شریک نہیں ہے'' (۳۴) پائپس لکھتا ہے:

> ''بنیاد پرست ہی جدیدیت نیز مغربیت کو مسترد کرتے ہیں یہ لوگ ٹی۔ وی سیٹ دریاؤں میں پھینکتے ہیں۔ کلائی کی گھڑیوں پر پابندی لگاتے ہیں۔ اندرونی احتراقی انجن کو رد کر دیتے ہیں'' ''اسلام جدید بننے کے لیے کوئی متبادل طریقہ فراہم نہیں کرتا۔'' (۳۵)

جب سیّد جمال الدین افغانی، سرسیّد اور اقبال جیسے مفکرین نے اِس مذہبی اور متشدد طبقے کی تربیت کی کوشش کی اور مسلمان معاشروں میں جدید علوم وفنون پر زور دیا تو ان پر مغرب زدگی کا لیبل چسپاں کر دیا گیا۔

استرداد کا روّیہ عہد جدید میں قطعاً نا قابل قبول ہے۔ آج گلوبل ولیج کے دور میں استرداد پسندوں کا انجام بقول ہنٹگٹن پہلے تصادم اور پھر خاتمہ ہے (۳۶) ٹائن بی کے الفاظ میں کٹر پن قابل عمل راستہ نہیں ہے (۳۷) یہ روّیہ حضورؐ کی اِس معروف حدیث

کے بھی خلاف ہے۔

''علم حاصل کرو چاہے تم کو چین ہی کیوں نہ جانا پڑے۔''

''حکمت تمہارا گمشدہ مال ہے جہاں سے ملے حاصل کرلو۔''

ویسے بھی تہذیبی اثرات کا عمل نہ صرف شعوری بلکہ لاشعوری بھی ہوتا ہے اِس لیے استرداد کی پالیسی کیسے اختیار کی جاسکتی ہے؟ اور ہم دیکھتے ہیں کہ اقبال کے نزدیک قدامت پرست لوگ ''کور ذوق وتہی کدو'' تھے۔ اس لیے اقبال نے مغربی تہذیب کو کلیتہً رد کرنے کی بجائے اس سے نہایت احتیاط کے ساتھ استفادہ کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ اسلام کی آفاقیت کے دعوے کو ثابت کرنے کے لیے یہ تہذیبی امتزاج اور بھی ضروری ہے۔

۲......دوسرا روّیہ یہ مغربی تہذیب کی اندھی نقالی کا ہے یعنی مغربی ماڈل کو بجنسہٖ اختیار کرنا۔ مغربی کلچر کو اپنی پوری زندگی پر حاوی کرنا۔ اقبال نے تجدد کے انتہا پسند علمبرداروں پر قدامت پرستوں کی طرح کڑی تنقید کی ہے ان کے نزدیک یہ تہذیبی خودی کی نفی ہے اس لیے انہوں نے مغرب کی ظاہری چمک دمک کی بجائے اس کی اندرونی روح سے پوری ناقدانہ بصیرت کے ساتھ استفادے کی تلقین کی ہے۔ اقبال کے یہ اشعار اس سلسلے میں توجہ چاہتے ہیں۔

نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی (۳۸)

شرق را از خود برد تقلید غرب
باید ایں اقوام را ''تنقیدِ غرب''(۳۹)

اس روّیے نے اقبال کے نزدیک نہ صرف مسلمانوں کی معنوی روح کو کچل دیا ہے بلکہ مغربی تہذیب کی برتری کا یقین پیدا کرکے اس کی ملوکانہ اغراض اور سامراجی تہذیبی مشن کو بھی آگے بڑھانے میں مدد دی ہے۔ پس مغربی تہذیب کا یہ ردعمل بھی

استرداد کی طرح ناکام ہے۔

۳......ان دونوں روّیوں کے درمیان ایک تیسرا روّیہ ابھرتا ہے جسے اصلاح پسندی یا آفاقیت کا روّیہ کہا جاسکتا ہے۔ یعنی اپنی تہذیب کے بنیادی مزاج اور بنیادی اقدار کو برقرار رکھتے ہوئے مغربی تہذیب کے صحت مند اور زندہ عناصر کو قبول کرنا۔ چنانچہ سیّد جمال الدین افغانی، مفتی محمد عبدہٗ، سرسیّد، شبلی، سیّد امیر علی، نامق کمال، مفتی عالم جان اور اقبال جیسے روشن خیال مفکرین نے بڑی جرأت کے ساتھ تازہ مغربی افکار کو اسلام کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ اِس روّیے کے حامل یہ ایسے مسلمان ہیں جو مغربی خیالات کو اسلام کے افکار کی روشنی میں جانچ پرکھ کر اختیار کرتے ہیں۔ اور اس طرح اپنی تہذیب میں جذب کر کے تہذیبی ہم آہنگی، پُر امن بقائے باہمی اور مکالمے کا ثبوت دیتے ہیں۔ چنانچہ ان کا کہنا تھا کہ ''اسلام جدید سائنس اور مغربی فکر کے بہترین اجزاء سے مطابقت رکھتا ہے'' ان مصلحین نے ''جدید سائنس، ٹیکنیکی یا سیاسی خیالات (آئینی اور نمائندہ حکومت اور اداروں) کو قبول کرنے کے لیے اسلامی جواز'' فراہم کیا۔ انہوں نے مغربی استعمار سے مقابلے کے لیے ان کی اصل طاقت یعنی سائنس، ٹیکنالوجی اور تنظیم کو اپنانے پر زور دیا۔(۴۰) اقبال کے خطبۂ اوّل کا مندرجہ بالا اقتباس ذہن میں لائیں تو واضح ہوجاتا ہے کہ اقبال بھی چاہتے تھے کہ مسلمان مغربی تہذیب کی حقیقت و نوعیت سے آگاہ ہوں۔ مغربی علم و حکمت حاصل کریں۔ تاکہ اس طرح خود اپنی اس تہذیب کی طرف مراجعت کرسکیں جس پر مغربی تہذیب کی صحت مند اقدار اور بنیادیں استوار ہیں۔ یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ اِن اصلاح پسند مفکرین کے ہاں جدیدیت اور مغربیت کا واضح فرق ملتا ہے۔ بقول ڈاکٹر جاوید اقبال:

> ''اصلاح پسند مفکرین ''جدیدیت'' اور ''مغربیت'' کے درمیان نہ صرف ایک واضح فرق بیان کرتے ہیں بلکہ ان کے نزدیک

جدیدیت معاشرتی زندگی کے بدلتے ہوئے تقاضوں کی قبولیت کا عمل ہے جبکہ مغربیت یا مغرب زدگی ایک غیر ملکی کلچر کو اپنی زندگی پر حاوی کرنے کا نام ہے اپنی روایات اور اقدار کے ساتھ وابستہ رہتے ہوئے تبدیلی یا جدیدیت کو قبول کیا جاسکتا ہے۔'' (۴۱)

اسی جدیدیت اور مغربیت کی وضاحت کرتے ہوئے پروفیسر آلِ احمد سرور لکھتے ہیں:

''جدید کاری (Modernization) اور مغربیت (Westernization) میں فرق ہے مغربیت کے معنی یہ ہیں کہ مغربیت کے ذہن کی تقلید کریں اور ترقی کا جو راستہ مغرب نے اختیار کیا ہے اس پر آنکھیں بند کر کے چلتے رہیں۔ مغربیت میں مغربی ماڈل کو بجنسہٖ اختیار کرنے کا معاملہ ہے، بیرونی اداروں کو اپنے گھر میں حکمران بنانے کا معاملہ ہے گویا ایک ادارے کو جو ایک خاص تحریک، تہذیب اور فضا رکھتی ہے اور خاص دھرتی اور آسمان سے آگاہ ہے ایک اجنبی فضا اور ماحول میں سامان کی طرح منتقل کرنے کا معاملہ ہے مگر جدید کاری میں مسئلہ تبادلے کا نہیں قلب ماہیت کا ہے۔ ٹرانسفر (Transfer) کا نہیں ٹرانسفرمیشن (Transformation) کا ہے۔ دوسروں کے ادارے بجنسہٖ نہیں لیے جاسکتے۔ سماجی ادارے ماحول کے مطابق ہی ڈھالے جاسکتے ہیں۔'' (۴۲)

گویا مغربیت یہ ہے کہ مغربی تہذیب اور مغربی تہذیب کی اقدار کو جوں کا توں قبول کرلیا جائے یعنی اندھی تقلید۔ اور جدیدیت یہ ہے کہ اپنی بنیادی اقدار بھی قائم رہیں

اور مغربی تہذیب کے زندہ اجزاء بھی جذب کرلیے جائیں۔ یہ نظریۂ عاریت (Borrowing Theory) ہے۔جس میں تہذیبیں دوسری تہذیبوں سے چیزیں مستعار لیتی ہیں اور ان کو ڈھال کر، بدل کر، جذب کرکے اپنی تہذیب کی اساسی اقدار کو مستحکم کرتی ہیں اور دوسری تہذیبوں کی بقا کی ضمانت دیتی ہیں۔(۴۳)

یہ اصلاح پسند مفکرین جدیدیت اور مغربیت میں فرق کی بنیاد پر اسی نظریۂ عاریت کے قائل ہیں چنانچہ سرسیّد ہوں یا اقبال ان کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اسی ''ثقافتی مستعاریت'' کو مدنظر رکھتے ہیں۔ وہ تہذیبی کشمکش میں مغربی ماڈل کو بجنسہٖ اختیار کرنے کے خلاف ہیں۔لیکن مغربی علم وحکمت کی ترقی، انفرادیت پر زور، آزادی کے تصور اور انسان دوستی جیسے عناصر کے قائل ہیں۔ثقافتی مستعاریت کے اسی تصور کے تحت ایسی کثیر تہذیبی دنیا وجود میں آتی ہے جہاں تصادم کی بجائے بات چیت اور مذاکرات کے ذریعے اختلافی اُمور کو بھی حل کیا جاسکتا ہے، امن اور انصاف کا حصول بھی ممکن بنایا جاسکتا ہے اور ایک دوسرے سے پُرامن لین دین اور استفادے کا عمل بھی تیز تر کیا جاسکتا ہے۔

تہذیبی تکثیریت کا یہ وہ تصور ہے جس میں اپنی تہذیبی خودی بھی برقرار رکھی جاتی ہے اور دوسری تہذیب کی خودی یا پاسداری بھی کی جاتی ہے۔ دوسری تہذیب کے بعض اجزاء کو قبول بھی کیا جاسکتا ہے اور بعض اجزاء کو رد بھی کیا جاسکتا ہے لیکن اِس رد میں اختلاف اصولی ہوتا ہے نہ کہ ذاتی اور متعصبانہ۔ اس لیے کسی تہذیب کے استحصال کی نوبت نہیں آتی بلکہ دوسری تہذیبوں کے ساتھ مسلسل ایک ڈائیلاگ کی کیفیت برقرار رہتی ہے اور بنیادی فکری امور میں اختلافات (تصادمات) کے باوجود ایک ہم آہنگی کی فضا قائم رہتی ہے۔ اس طرح تہذیبی تکثیریت کا یہ نظریہ آفاقی تہذیب کے ایسے نظریے میں ڈھل جاتا ہے جس میں دیگر تہذیبیں بھی اپنا وجود رکھتی ہیں اور اپنا وجود رکھتے ہوئے ایک

دوسرے کے ساتھ انسانی بنیادوں پر ہم آہنگ ہو جاتی ہیں۔
تہذیبی کشمکش کے اِس دور میں اسلام اور مغرب کو اِسی ''ثقافتی مستعاریت'' کی ضرورت ہے۔ آج دونوں کے مستقبل کا انحصار اسی افہام و تفہیم پر ہے کہ دونوں تہذیبیں ایک دوسرے کو کچھ سکھاتے ہوئے آگے بڑھیں۔ ایک دوسرے کی تاریخ، فن اور ثقافت، تصورات اور اقدار کا مطالعہ کرتے ہوئے، ایک دوسرے کی زندگیوں کو زرخیز بناتے ہوئے ایک نئے اور پُر امن عالم کی تخلیق کریں، اس کے برعکس دوسرا راستہ تصادم اور کشیدگی کا ہے۔ اس سلسلے میں اسلام اہم ترین کردار ادا کرسکتا ہے اِس لیے کہ اسلام میں سب انسان برابر ہیں۔ حریت، مساوات اور اتحادِ انسانی اس کی بنیادی اقدار ہیں اور اس لیے کہ اسلام ہی وہ دین ہے جس کا مقصد ''باوجود تمام فطری امتیازات کے عالمِ بشریت کو متحد و منظم کرنا ہے۔'' (۴۴)

حواشی

1. Said,Edward,Orientalism, Penguin Books, India,2001,PP301,302

۲۔ تفصیل کے لیے دیکھیے:

i) مضمون ''توہین آمیز خاکوں کی اشاعت اور مغرب کا ردّیہ'' از سفیر احمد صدیقی (لیفٹیننٹ کرنل، ر)، روزنامہ جنگ، ملتان، مارچ ۲۰۰۶ء، ص ۸؛

ii) مزید تفصیل کے لیے ویب سائٹ ملاحظہ کیجیے:

http"//en.wikipedia.org/wiki/list_of_newspapers_that_reprint_jyllands_posten%27_muhammad_cartoons.

3. Huntington,"The Clash of Civilizations and the Remaking of World Order", Simon and Schuster, News York, 1997, see part iv.

4. Huntington,"Clash of Civilizations",PP.258,263

5. Cheryl Benard,"Civil Democratic Islam", Rand Corporation, Los Angeles, California,20003,PP.448,449

۶۔ ابوالحسن علی ندوی، سیّد، مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، مجلس نشریات اسلام، کراچی، سن ندارد، ص ۸۷، ۸۸

۷۔ عزیز احمد، پروفیسر، برصغیر میں اسلامی جدیدیت، ترجمہ، جمیل جالبی، ڈاکٹر، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۱۲، ۱۵۸

۸۔ دینی قیادت سے متعلق اِن مباحث کی تفصیل و تصدیق کے لیے دیکھیے:

i) اکرام، شیخ محمد، موجِ کوثر، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۱۸۷ تا ۲۱۱، ۳۵۱ تا ۳۶۱

ii) عزیز احمد، برصغیر میں اسلامی جدیدیت، ترجمہ، جمیل جالبی، ڈاکٹر، ص ۱۵۸ تا ۱۶۸

iii) جمیل جالبی، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۹۷ء، ص ۱۴۴ تا ۱۴۶

iv) ابوالحسن علی ندوی، سیّد، مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، ص ۸۸ تا ۹۵

v) پنجاب یونیورسٹی، (مرتب)، تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند، (جلد ہشتم)، لاہور، ۱۹۷۱ء، ص ۲۵، ۲۶

vi) پنجاب یونیورسٹی، (مرتب)، تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند (جلد نہم)، لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۲۶، ۲۷

vii) عقیل، معین الدین، ڈاکٹر، اقبال اور جدید دنیائے اسلام، مکتبۂ تعمیر انسانیت، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۳۰۹

viii) قاضی جاوید، سرسیّد سے اقبال تک، تخلیقات، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۱۱۸ تا ۱۲۱، ۱۲۹، ۱۳۰

۹۔ اکرام، شیخ، محمد، موجِ کوثر، ص ۳۲۵

۱۰۔ عزیز احمد، برصغیر میں اسلامی جدیدیت، ترجمہ، جمیل جالبی، ڈاکٹر، ص ۶۰

۱۱۔ سرسیّد، مقالاتِ سرسیّد، مرتبہ، محمد اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۲ء، جابجا مثلاً جلد اوّل صفحات ۳۷، ۳۸، ۳۸۱، ۳۸۲

۱۲۔ سرسیّد، تہذیب الاخلاق، (جلد دوم)، مرتبہ، منشی فضل الدین، مصطفائی پریس، لاہور، ۱۸۹۵ء، ص ۱

۱۳۔ سرسیّد، مجموعۂ لیکچرز سرسیّد احمد خان، مرتبہ، منشی سراج الدین احمد، مصطفائی پریس، لاہور، ۱۸۹۲ء، ص ۱۱۹

۱۴۔ امین زبیری، تذکرۂ سرسیّد، یونائیٹڈ پبلشرز لمیٹڈ، لاہور، سن ندارد، ص ۴۶، ۴۷

۱۵۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر، ص ۱۴۷

۱۶۔ سرسیّد، مقالاتِ سرسیّد، (جلد دہم)، مرتبہ، شیخ اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب،

لاہور، ۱۹۶۲ء، ص ۲۵۳

۱۷۔ سرسیّد، خطباتِ سرسیّد، (جلد دوم)، مرتبہ، شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۳ء، ص ۲۷۶

۱۸۔ حنیف رامے، اسلام کی روحانی قدریں۔ موت نہیں زندگی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۲۴۱

۱۹۔ اقبال۔ حرفِ اقبال، مرتبہ، لطیف احمد شروانی، ص ۱۴۸

۲۰۔ نذیر نیازی، سیّد، اقبال کے حضور، اقبال اکادمی کراچی، ۱۹۷۱ء، ص ۲۸۴، ۲۸۵

۲۱۔ عابد علی عابد، شعر اقبال، بزم اقبال، لاہور، ۱۹۶۴ء، ص ۳۵

۲۲۔ اقبال، اقبال نامہ، مرتبہ، شیخ عطاء اللہ، (طبع نو، تصحیح و ترمیم شدہ ایڈیشن، یک جلدی اشاعت)، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۹۸، ۹۹

۲۳۔ کلیاتِ اقبال اردو، مرتبہ، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۴۴۰

۲۴۔ اقبال، اقبال نامہ، مرتبہ، شیخ عطاء اللہ (طبع نو، تصحیح و ترمیم شدہ ایڈیشن، یک جلدی اشاعت)، ص ۹۸، ۹۹

۲۵۔ ابوالحسن علی ندوی، سیّد، نقوشِ اقبال، مجلس نشریاتِ اسلام، کراچی، سن ندارد، ص ۳۹، ۴۰

۲۶۔ فتح محمد ملک، اقبال فراموشی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۵۵

۲۷۔ کلیاتِ اقبال فارسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۷۵ء، ص ۶۶۴

۲۸۔ i) اقبال، تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، (خطبہ اوّل/ پنجم)، ترجمہ، نذیر نیازی، سیّد، بزم اقبال، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۱۱/ ۱۹۷؛

ii) اقبال، مقالاتِ اقبال (''اسلام اور علومِ جدیدہ'')، مرتبہ، عبدالواحد معینی، سیّد، آئینۂ ادب، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۲۸۰، ۲۸۱

۲۹۔ اقبال، تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ (خطبہ اوّل)، ترجمہ، نذیر نیازی، سیّد، ص ۱۱

۳۰۔ نذیر نیازی، سیّد، اقبال کے حضور، ص ۲۸۵

۳۱۔ اقبال، تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ (خطبہ اوّل)، ترجمہ، نذیر نیازی، سیّد، ص ۱۲، ۱۳

۳۲۔ ایضاً، ص ۱۳

۳۳۔ کلیاتِ اقبال اردو، ص ۵۸۵

۳۴۔ اس کے لیے ملاحظہ کیجیے:

Said,Edward,"Orientalism",PP.296,297

35. Pipes,Denial, In the path of God', basik Books, New York, 1983,PP.197,349

36 Huntington,"Clash of Civilizations",PP.73

37. Ibid.

۳۸۔ کلیاتِ اقبال اردو، ص۶۵۴

۳۹۔ کلیاتِ اقبال فارسی، ص۷۶۶

۴۰۔ ان مباحث کے لیے دیکھیے:

i) جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رود، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص۱۵۹، ۱۶۰، ۱۹۶

ii) جاوید اقبال، ڈاکٹر، مضمون ''اقبال اور تہذیبوں کے مابین مکالمے کی اہمیت''، مشمولہ، اقبال مشرق و مغرب کی نظر میں، مرتبہ، سوندھی ٹرانسلیشن سوسائٹی، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص۱۰۹

iii) اقبال، حرفِ اقبال، مرتبہ، لطیف احمد شروانی، ایم ثناء اللہ خان، انشا پریس، لاہور، ۱۹۵۵ء، ص۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۱

iv) Esposito, John,L.,"Islamic Threat: myth or reality, Oxford University Press,New York, 1992,P.55;

v) Pipes,"In the Path of God",P.114-120

vi) Stoddard,L.S.,"The New World of Islam",Oxford University Press,New York, 1922,P.54

۴۱۔ جاوید اقبال، ڈاکٹر، مضمون ''اقبال اور تہذیبوں کے مابین مکالمے کی اہمیت''، مشمولہ، اقبال مشرق ومغرب کی نظر میں، ص۱۰۹

۴۲۔ سرور، آل احمد، پروفیسر، مقالہ ''اقبال اور نئی مشرقیت''، مشمولہ، دانشورِ اقبال از سرور، آل احمد، پروفیسر، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص۵۱، ۵۲

43. i)Spenglar,"Decline of the West",(Vol.II)A.A.Knopf,New

York,1928,P.50;

ii) Bozeman,"Civilization under Stress",Verginia Quarterly Review 51,(Winter 1975),PP.5;

iii) Huntington,"Clash of Civilizations",PP.76.

۴۴۔ اقبال، مقالاتِ اقبال (جغرافیائی حدود اور مسلمان)، مرتبہ، عبدالواحد معینی، سیّد، ص ۲۶۶